اسلامی ثقافت کی روح اور اقبالؒ

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین

انگریزی لفظ Culture اور اس کا مترادف لفظ ثقافت بہت ابہام لیے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لفظ بہت سطحی اور محدود معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ اس کا اطلاق اکثر و بیشتر حالات میں رقص و سرود پر کیا جاتا ہے یا پھر اس میں لباس و سامان آرائش اور دیگر آلات و ظروف نیز مذہبی عقائد اور اوہام و خرافات کو بھی شامل سمجھا جاتا ہے۔ اس کے عمیق و وسیع معانی کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جن چیزوں کو عموماً" ثقافت کا نام دیا جاتا ہے' وہ دراصل ثقافت کی مظاہر ہوتی ہیں جن کے لیے موزوں اصطلاح "تمدن" ہے جبکہ ثقافت کا تعلق ہمارے نظام اقدار و نظریات سے ہوتا ہے۔

ہمیں اپنے ارد گرد انسانی ایجادات' اختراعات' مصنوعات اور عادات و اطوار کا جو تنوع نظر آتا ہے' وہ ہماری Civilization یا تمدن ہے' اور اس کے پس منظر میں کار فرما کائنات اور حیات کے بارے میں ہمارے نظریے' خوب وزشت کے پیمانے' ہماری آرزوئیں اور تمنائیں ہمارے کلچر یا ثقافت کی بنیاد یا روح ہیں اور انہی کی بدولت ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی خاص شکل و صورت اختیار کرتی ہے۔

متعدد حیاتیاتی ضرورتوں میں انسان دوسرے جانداروں کی طرح عمل کرتا ہے لیکن دونوں کے عمل میں فرق یہ ہے کہ جانداروں کی ضروریات اور تکمیل کا سلسلہ ان کی جبلتوں کے تابع ہوتا ہے' وہ اپنے لیے گھر اور گھونسلہ بناتے ہیں اور قدرتی پناہ گاہوں سے استفادہ کرتے ہیں' بھوک اور پیاس مٹانے کا وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جس کا حلال و حرام یا ذائقے کی کیفیت وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' وہ رنج و غم' پسند و ناپسند اور نفرت و محبت کے معاملے میں بھی خیر و شر کے احساس سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس انسان اپنی رہائش' خوراک' لباس اور دیگر امور میں اپنے عقائد و نظریات اور معیار و اقدار کو بنیادی حیثیت دیتا ہے۔ ان چیزوں کو زمانی اور مکانی تقاضوں کے مطابق خوب سے خوب تر بنانے کے لیے تخیل و تفکر سے کام لیتا ہے۔ لہٰذا ثقافت' تہذیب اور تمدن کا تعلق صرف اور صرف انسانی معاشرے سے ہوتا ہے۔

مختلف علاقوں کے لوگوں کے تمدن میں جو فرق نظر آتا ہے' وہ دراصل ثقافتی اقدار کے علاوہ مخصوص تاریخی اور جغرافیائی احوال کا ثمر ہوتا ہے۔ بہرحال' یہ امر آیات ربانی میں شمار کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہی نوع کی ثقافتی و تہذیبی قدروں کو ماننے والے مختلف علاقائی اثرات کے تحت

مختلف تمدنوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تمدنی اختلاف فطرت کے عین مطابق ہے۔ ایک ہی برادری کے افراد بھی بعض یکساں میلانات و خصوصیات رکھنے کے باوجود مختلف انداز فکر رکھ سکتے اور مختلف طریقوں پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ زندگی کی تمام صورتوں میں اس کی مثالیں ملتی ہیں' جیسے گلاب پھولوں کی ایک نوع ہے لیکن یہ پھول یکساں نوعی خصوصیات کے باوجود رنگ و روپ کے اعتبار سے بے حد تنوع کا حامل ہے۔ کچھ یہی کیفیت ایک ملت یا تہذیب و ثقافت کے علمبرداروں کی ہوتی ہے جو مختلف تاریخی اور جغرافیائی یا نسلی حوالوں سے ایسے تنوع یا بوقلمونی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو ان کے بنیادی اصولوں اور قدروں سے متناقض نہیں ہوتی۔

قدرت نے ملت اسلامیہ کو بے پناہ ثقافتی قوت و توانائی سے بہرہ ور کیا ہے۔ اس میں پھولنے پھلنے اور مختلف زمانی و مکانی احوال و کیفیات سے مطابقت اختیار کرنے اور پھر اپنی امتیازی اور مخصوص حالت کو برقرار رکھنے کی بے مثال صلاحیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے زیر اثر دنیا میں متعدد تمدن وجود میں آئے جن میں عرب' ایران' ترکی' افریقہ' اندلس' جنوب مشرقی ایشیا اور مشرق بعید کے اسلامی تمدن قابل ذکر ہیں۔ پھر ان میں سے ہر تمدن کے اندر مختلف رنگوں کی جھلک نظر آتی ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں ان تمام تمدنوں کے انفرادی حسن و جمال کو اجاگر کیا ہے اور ان کے آفاقی اور عالمگیر خدوخال کو نمایاں کرنے کے لیے "تشکیل جدید" کے خطبات میں موثر انداز اختیار کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا خطبہ "اسلامی ثقافت کی روح" بے مثال فکری کاوش ہے جس نے مغربی مفکرین اور مستشرقین کے تعصب آمیز خیالات کی تردید میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان لوگوں نے اسلامی تہذیب و ثقافت کو اول تو تسلیم ہی نہیں کیا' اور اگر تسلیم کیا ہے تو اس کو ایک موثر اور فعال قوت کی حیثیت سے قبول نہیں کیا اور علوم و فنون کے میدان میں اسلامی اثرات کا نہایت ڈھٹائی سے انکار کیا ہے' اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انہوں نے ہم عصر اسلامی معاشرے کے زوال و ادبار کے پیش نظر یہ رائے قائم کی کہ اب اس کے از سر نو عروج کا معاملہ خواب و خیال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ گویا یہ ہمیشہ کے لیے دم توڑ چکی ہے۔

علامہ اقبال نے موثر دلائل سے یہ ثابت کیا کہ اسلامی تہذیب و ثقافت ایک حقیقت ہے اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ثقافت دنیا کی واحد مثبت اور تعمیری قوت ہے جس کی بنیاد عالمگیر اخوت و محبت کے تصور پر استوار ہے۔ اس نے رواداری کے اصول پر جس طرح عمل کر کے دکھایا' اس سے اس کی انسان دوستی نمایاں ہوتی ہے۔ اس میں اگر پھیلنے اور غالب آنے کا رجحان ہے تو اس کے ساتھ ساتھ **لا اکراہ فی الدین** کا اصول بھی موجود ہے۔ اس تہذیب کا خاصہ ہے کہ اس نے علمی خزانوں کے دروازے مشرق و مغرب پر کھول دیے اور دوسروں کے تجربوں اور اچھی باتوں سے استفادہ کرنے سے کبھی احتراز نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت ہر اعتبار سے باثروت رہی ہے۔ اغیار کے رہن سہن اور طور طریقے اختیار کرنے میں جہاں افراط و تفریط کی کیفیت پیدا ہوئی' وہاں اس کی اندرونی قوت مزاحمت نے اصلاحی تحریکوں کی صورت میں

منظم ہو کر اس کے جداگانہ تشخص کو محفوظ رکھنے کی بھرپور سعی کی۔

علامہ اقبال نے بحیثیت مفکر و مصلح اسلامی ثقافت کے مظاہر پر نہیں' روح پر بحث کی ہے۔ انہوں نے نہ تو لفظ ثقافت اور اس کے ماخذ اور اس کے اطلاقی پہلوؤں کی وضاحت کی ہے اور نہ ہی اسلامی ثقافت کے جملہ اصولوں ہی کی تشریح کی ہے۔ انہوں نے اسلامی ثقافت کے اہم تر پہلوؤں کو مرکز توجہ بنایا ہے جن میں توحید' رسالت' تصور علم' کائنات و تاریخ کے مطالعے کی ضرورت' زمان و مکان کی حقیقت وغیرہ امور شامل ہیں۔

اسلامی ثقافت کی روح پر بحث کے سلسلے میں عقیدۂ توحید کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اقبال کے نزدیک توحید' اسلام' مسلمانوں اور عالم انسانیت کے لیے قوت اور رہنمائی کا ابدی خزینہ ہے۔ وہ اس امر پر تشویش ظاہر کیے بغیر نہیں رہتے کہ فلسفیوں اور نقیہوں کی موشگافیوں کی بدولت ہم اس کی اصل اہمیت سے غافل ہو چکے ہیں' انہوں نے اس کے امت ساز اور کردار ساز پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اقبال نے "ضرب کلیم" کی نظم "لا الہ الا اللہ" میں توحید کی اس خصوصیت کو واضح کیا ہے۔ اپنی نظم "توحید" میں وہ اس کے عملی پہلو کو یوں اجاگر کرتے ہیں:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے' فقط اک مسئلۂ علم کلام

توحید کی بدولت انسان کو اپنے حقیقی مرتبہ و مقام سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ربط و نظم وجود میں آتا ہے۔ نظری حیثیت سے تو توحید محض یہ تسلیم کرنے سے عبارت ہے کہ اللہ ایک ہے' لیکن عملی حیثیت سے توحید اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کے ماننے والوں میں وحدت فکر و عمل کارفرما ہو۔ اقبال کے نزدیک توحید پر ایمان لانے کے نتیجے میں مسلمانوں میں اتحاد عمل پیدا ہونا چاہیے۔ توحید وحدت افکار کے ساتھ ساتھ وحدت کردار کی طلب گار بھی ہے۔ وحدت کردار ہی کی بدولت مسلمانوں کی عملی زندگی منشکل ہوتی اور اسلامی اقدار کی اشاعت اور غلبے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ توحید کی بدولت انسانی اور دین و دنیا کی وحدت کا تصور اجاگر ہوا' اور یہی وہ بنیادی اصول ہے جو ملت اسلامیہ کو تغیر و انقلاب سے نبرد آزما ہونے کے قابل بناتا ہے۔

توحید پر ایمان کی بدولت ہمیں ایک جامع نظریہ ء علم بھی حاصل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی رویوں کی صحت مند تشکیل میں ایک جامع نظریہ ء علم کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اقبال نے علم بالحواس کی افادیت کا بارہا ذکر کیا ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ علم کے ایک اعلیٰ تر سرچشمے کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں جسے وہ کشف و وجدان کا نام دیتے ہیں جسے اولیاء و انبیاء سے نسبت دی جاتی ہے' لیکن وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ صوفی اور نبی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ صوفی کے کشف و وجدان میں خطا کا احتمال ہوتا ہے لیکن نبی پر جو وحی نازل ہوتی ہے' وہ ہر قسم کے شک و شبہہ سے بالاتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی کا الہام حق و باطل اور اسلام و کفر کا معیار نہیں ہوتا جبکہ پیغمبرانہ وحی و الہام حق و باطل کے لیے میزان و فرقان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صوفی کو جب ذات

الٰہی تک رسائی حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کی لذت میں محو ہو جاتا ہے' اسے دوسروں کے بارے میں کوئی فکر نہیں ہوتی' اس کے برعکس نبی یا رسول انکشاف حقیقت کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ وہ دنیا کی رہنمائی کا مکلف بھی ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبال نے خطبہ پنجم کے آغاز میں مشہور صوفی شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے اس ملفوظ کے ذریعے اشارہ کیا ہے:

"محمد مصطفیٰؐ در قاب قوسین او ادنیٰ رفت و باز گردید واللہ ما باز نگردیم"

یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ انتہائی قرب الٰہی سے بہرہ ور ہوئے لیکن واپس آ گئے۔ خدا کی قسم اگر ہمیں یہ موقع ملتا تو کبھی واپس نہ آتے۔

ولی یا صوفی وجدان میں غرق ہو جاتا ہے' نبی اس حال سے واپس آ کر عالم انسانیت کی تعمیر نو میں سرگرم ہو جاتا ہے۔ نبی کی زندگی میں اگر حرا کی خلوتیں ہیں تو اس کو ہم مکہ و طائف کے گلی کوچوں میں متحرک اور بدر و احد میں سرگرم پیکار بھی پاتے ہیں۔ نبی کی باز آمد کو اقبال نے اس کے مشاہدات و تجربات کی قدر و قیمت کے لیے آزمائش و امتحان قرار دیا ہے۔ اقبال کا عشق رسول ﷺ مسلمہ حقیقت ہے' لیکن انہوں نے نبوت و رسالت کی اہمیت کو جس طرح نئے استدلال کے ساتھ واضح کیا ہے' وہ بھی لائق توجہ ہے۔ مثلاً" وہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ پر ایمان کی بدولت ہمارے اندر محبت و اخوت کا عمیق جذبہ پیدا ہوا ہے' اس جذبے نے ہمیں ایک امت و ملت کی صورت دی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی ہجرت نے ہم پر مسئلہ ء وطنیت و قومیت کی نئی جہتیں واضح کی ہیں' اور آپؐ پر ختم نبوت نے ملت اسلامیہ کو خصوصاً" اور عالم انسانیت کو عموماً" بے شمار و بے مثال نعمتوں سے نوازا ہے۔ آپؐ کی بدولت انسانی ارتقاء کی راہیں روشن اور عروج آدمیت کے مدارج واضح ہوئے۔ اسی لیے اقبال کہتے ہیں:

؎ وہ دانائے سبل' ختم الرسل' مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

اقبال کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی بعثت ایک ایسے مرحلے پر ہوئی جسے انسانیت کے بلوغ یا تکمیل شعور کا مرحلہ کہا جا سکتا ہے' اس لیے حضور اکرم ﷺ کی حیثیت قدیم و جدید دنیا کے درمیان واسطے کی سی ہے' اور آپؐ پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔ اس مرحلے کا تقاضا یہ تھا کہ دین کی نعمت کا اتمام کر دیا جائے اور انسانیت پر علم کے وہ سرچشمے منکشف کر دیے جائیں جو اس کی آئندہ ضروریات کی تکمیل میں مدد و معاون ہیں۔

علم و حکمت کے ان تازہ سرچشموں میں عقل استقرائی کا ظہور بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے دنیا کے علوم و فنون کو بے مثال انقلاب سے دوچار کیا۔ عقل استقرائی کے ظہور نے اس امر کی طرف اشارہ کر دیا کہ اب سلسلہ ء نبوت و رسالت کو ختم ہو جانا چاہیے اور انسان کو اپنے وسائل علم سے کام لینے کی ابتدا کر دینی چاہیے۔ اقبال کے خیال میں ختم نبوت کا اعلان اور عقل استقرائی کا ظہور ہی تھا جس کی بنا پر ایک طرف دینی پیشوائیت اور موروثی بادشاہت کی نفی کی گئی اور دوسری

طرف بار بار تجربہ و مشاہدہ اور تعقل و تفکر پر زور دیا گیا نیز عالم فطرت اور تاریخ کو بھی سرچشمہ علم بتایا گیا۔ اس طرح اقبال نے واضح کر دیا کہ ختم نبوت کے اعلان کے بعد اگر کوئی آدمی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ اسلامی ثقافت کی روح پر حملہ آور ہوتا ہے کیونکہ وہ اس طرح عقل استقرائی کی تردید کرتا ہے' دوسری طرف اپنے کشف و وجدان کو تنقید سے بالاتر قرار دے کر ملت کے لیے نوع بہ نوع خطرات کا سبب بنتا ہے۔ اقبال نے اس استدلال کی بنیاد پر قادیانیت کے خلاف جو کچھ کہا یا لکھا' وہ ہماری فکری تاریخ کا قیمتی سرمایہ ہے۔

اقبال نے مطالعہ تاریخ کی اس افادیت کو اجاگر کرتے ہوئے کائنات میں روانی اور حرکت کی موجودگی کا اثبات کیا ہے' اور فکر یونان کی یہ خامی واضح کی ہے کہ اس کا میلان سکون و جمود کی طرف تھا۔ اس سلسلے میں اقبال نے مسلمانوں کی ان خدمات پر روشنی ڈالی ہے جو انہوں نے علم و سائنس کے میدان میں انجام دیں اور جن کا اعتراف بریفالٹ جیسے محققین نے کیا ہے۔ مسلمانوں نے سائنسی منہاج کی تشکیل میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے' وہ بھی انتہائی لائق تحسین ہے۔

شروع شروع میں مسلمانوں پر یونانی افکار نے تصرف حاصل کر لیا' لیکن بہت جلد وہ اس سے نجات پانے میں کامیاب ہو گئے۔ قرآن نے انہیں تناہی سے لاتناہی کی طرف حرکت کی تلقین کی اور ارتقائے انسانی کا وسیع میدان ان کے سامنے رکھا۔ ابن مسکویہ اور جاحظ نیز رومی وغیرہ نے ارتقاء کے اچھوتے نظریے قائم کیے۔ عصر حاضر کے انسان کی ساری توجہ اس امر پر مرکوز ہے کہ اس دنیا کی خوشیوں اور لذتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے کہ اس کے بعد زندگی کا کوئی امکان نہیں۔ اس نظریے نے انسان کو مستقبل سے مایوس کر دیا ہے۔ اقبال نے رومی کے تتبع میں اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ زندگی کا سفر لاتناہی ہے۔ جس طرح انسان نے جمادات' نباتات اور حیوانات کے بعد انسان کے مرتبے تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی ہے' اسی طرح وہ ملائکہ سے بھی آگے نکل سکتا ہے۔ اس کے وجود میں کوئی ظاہری تبدیلی آئے یا نہ آئے' روحانی اور اخلاقی اعتبار سے اس کا سفر ارتقاء جاری ہے۔ اور جاری رہے گا۔ منزل ماکبریاست اسی سفر کا اشارہ ہے' اور فرشتہ صید و یزداں گیر بننا نیز بقائے دوام سے ہمکنار ہونا اس کا مقدر ہے۔ موت جسم پر واقع ہوتی ہے' انسان کی شخصیت کو فنا نہیں کر سکتی بشرطیکہ اس نے اپنی شخصیت کو مستحکم بنا لیا ہو' لہٰذا موت سے ڈرنے اور مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور عراقی یا محمود اشنوی اور خواجہ محمد پارسا نے ماہیت زمان و مکان کے بارے میں جو کچھ کہا' وہ علم کی دنیا میں ہمیشہ لائق توجہ رہا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو فلسفہ و تاریخ کی بنیاد بنی اور اسی کے شعور سے بہرہ ور ہو کر علامہ ابن خلدون نے اپنے شہرہ آفاق مقدمہ و تاریخ میں اقوام و ملل کے آغاز و انجام اور عروج و زوال کے اسباب پر غور و خوض کیا اور دنیا میں معاشرتی علوم (Social Sciences) کی بنیاد رکھنے کا شرف حاصل کیا۔

وحدت حیات' اسلامی ثقافت کا ایک اور بنیادی تصور ہے۔ اسلام سے قبل اگر یہ تصور موجود تھا تو محض علمی حیثیت سے' جبکہ اسلام نے اس کو عملی شکل دینے کی کامیاب کوشش کی۔

اسلام نے تمام نوع انسانی کو مخلوق خدا اور اولاد آدم ہونے کی بنا پر ایک کنبہ یا برادری قرار دیا ہے اور رنگ، نسل، قبیلے، ذات، زبان، وطن اور خون وغیرہ کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق کو باطل ٹھہرایا ہے۔ اسلام ہی نے ایک ایسے معاشرتی اور معاشی نظام کے خد و خال اجاگر کیے جس میں رنگ و نسل، اقتدار اور سرمایے کی بدولت وجود میں آنے والی اونچ نیچ اور طبقہ واریت کو کامیابی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو بین الاقوامی سطح پر استعمار و استحصال کو ختم اور عدل و امن کو قائم کر سکتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان کے نام اقبال کے مکتوب 24 جون 1923ء اور قائد اعظم کے نام مکتوب 28 مئی 1937ء میں شریعت حقہ کے اس کردار کو واضح کیا گیا ہے۔

پھر قرآن مجید زمانے کو ایک حقیقت اور زندگی کو مسلسل اور مستقل حرکت قرار دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ ابن خلدون تھا جس نے ابن مسکویہ اور البیرونی کے بعد اس بات پر زور دیا کہ زمانہ ایک ارتقائی اور تخلیقی قوت ہے۔ یونانی فلسفیوں نے اس کو ایک دائرے میں گردش کرتے ہوئے بتایا ہے۔ یہ ارتقاء اس کی رجعت یا تکرار ہے لیکن اسلام نے اس تصور کی سختی سے تردید کی اور اس کی تخلیق استعداد اور مسلسل حرکت کا اثبات کیا ہے۔ لیکن یہ حرکت و استعداد بے منزل و مقصد نہیں بلکہ خوب سے خوب تر کی جستجو کا ایک ایسا سلسلہ ہے جو مشیت الٰہی کے تابع اور تخلیق کائنات کے عظیم الشان منصوبے کی عمیق مقصدیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ ہر لحہ، لحہ ء تخلیق ہے اور ہر لحہ توسیع کائنات کی صدا لگا رہا ہے۔

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں

اس نے ایام اللہ یا تاریخ کو سرچشمہ ء علم قرار دیا اور ثابت کیا کہ قوموں کا محاسبہ انفرادی اور اجتماعی، دونوں لحاظ سے کیا جاتا ہے اور اس دنیا میں بھی انہیں اعمال کا بدلہ مل جاتا ہے۔ ابن خلدون کے اس مطالعہ ء تاریخ کو زیادہ منظم اور مربوط صورت میں شپنگلر نے پیش کیا۔ لیکن اقبال کو شکایت ہے کہ وہ اسلامی تہذیب کی ماہیت کو نہ جان سکا، اس نے اسلامی تہذیب کو مجوسی تہذیب کے دائرے میں رکھ کر اپنی لاعلمی کا ثبوت دیا ہے اور اسلامی تہذیب کے ہمیشہ کے لیے ختم اور مغربی تہذیب سے بے نیاز ہونے کا دعویٰ کر کے تعصب کا مظاہرہ کیا ہے۔ اقبال نے شپنگلر کے ان مزعومات کی قطعی دلائل سے تردید کی اور ان وجوہ پر بحث کی جن کی بدولت اسلامی ثقافت فنا کی قوتوں سے محفوظ رہی ہے۔ ان میں سے ایک زمانے کا حرکی تصور ہے۔

زمانے کے اس حرکی تصور کے طفیل اسلامی ثقافت جمود و تعطل سے محفوظ رہی اور اس تصور کے زیر اثر اسلامی معاشرے میں اجتہاد کے اصول کو عملی زندگی کا جزو بنایا گیا۔ زمان و مکان کی تبدیلی سے جو نئے مسائل سامنے آتے ہیں، ان کے حل کے لیے قرآن و سنت کی روشنی میں نئے فیصلوں کی بدولت ملت اسلامیہ کے تسلسل اور دوام کو یقینی بنا دیا گیا ہے۔ اقبال نے اپنے خطبے "الاجتہاد فی الاسلام" میں اس اصول پر سیر حاصل بحث کی ہے اور بعض نہایت اہم سیاسی اور قانونی مسائل و معاملات کے بارے میں اپنا نقطہ ء نظر پیش کیا ہے۔ بظاہر اس اصول کا تعلق فقہ سے ہے،

لیکن اس اصول کی مقصدیت پر اگر غور کیا جائے تو واضح ہو گا کہ یہ صرف فقہی معاملات ہی نہیں، تہذیب و ثقافت کے جملہ پہلوؤں میں بھی کار فرما ہے، اور یہی اصول ملت اسلامیہ کے فکری و عملی رویوں کی پیہم تشکیل نو کا ضامن بھی ہے۔ اس اصول نے روایات پر نقد و نظر کو لازم ٹھہرایا، اور خذ ما صفا ودع ما کدر کا لائحہ ء عمل دیا ہے۔ اسی اصول کی بدولت ملت اسلامیہ میں یہ استعداد پیدا ہوئی ہے کہ وہ ساری دنیا کے صالح افکار اور مہذب رویوں کو اپنے اندر سمو سکے اور اپنے عمل کو نتیجہ خیز اور موثر بنا سکے۔

اسلامی تہذیب کا طرۂ امتیاز انسان کے ذوق جمال کی قدر دانی ہے۔ "اللہ جمیلٌ و یحب الجمال" اس کا ماٹو ہے۔ حسن و جمال کائنات کا خاصہ ہے اور حیات انسانی کا لازمہ۔ قرآن حکیم نے لذت کام و دہن اور زینت جسم و لباس وغیرہ کو حرام قرار نہیں دیا۔ حضورؐ کی نظر میں حسن و جمال کی جو قدر و منزلت تھی، اس کی شہادت آپؐ کی سیرت طیبہ سے ملتی ہے۔ لیکن اسلام نے ہر حال میں روحانیت کو فوقیت عطا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے صرف ان فنون کو لائق توجہ سمجھا جن سے ان کا روحانی تشخص نمایاں ہوتا ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اقبال نے حسن فطرت اور حسن صوت و صورت کو ہمیشہ سراہا، لیکن ایک فلسفی کی حیثیت سے انھوں نے حسن و جمال کی ماہیت اور زندگی میں اس کی اہمیت پر برسوں غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ حقیقت، جمال و جلال کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات دونوں صفات کی حامل ہے۔ اس کا جمال، جلال سے ہم آہنگ ہے، محض جمال سطح نظر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ نزاکت، ضعف اور محتگی سے عبارت ہوتا ہے، اس میں جلال یعنی قوت کی شمولیت ضروری ہے۔ گویا جمال و جلال کا امتزاج ہی فن کی عظمت اور دوام کا باعث ہے۔ فن محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ بے پناہ ثقافتی و تہذیبی تخلیقی قوتوں کا مظہر ہوتا ہے۔ اقبال اس فن کے قدر دان ہیں جو خودی کی افزائش و استحکام کا باعث ہے، جس کی تخلیق میں خون جگر، قوت تسخیر، جذبہ ء عشق، عظمت خیال، جذبہ ء حریت اور ذوق حسن و جمال کار فرما ہوں۔ ان کے نزدیک مسجد قرطبہ فن تعمیر کا شاہکار ہے کیونکہ وہ مرد مومن کی طرح جلال و جمال کا مجموعہ ہے۔ وہ اسلامی تہذیب کی روحانی و مادی فتوحات کا مرقع ہے۔ اقبال کے نزدیک فن کے عظیم نمونے آزاد افراد و اقوام ہی کے ہاتھوں وجود میں آسکتے ہیں کیونکہ ان کے ذہن کشادہ، خیالات بلند اور افعال پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ انھوں نے مثنوی "بندگی نامہ" اور "ضرب کلیم" کے حصے فنون لطیفہ، میں اس نقطہ ء نظر کی وضاحت کی ہے۔ اسی طرح اقبال نے صنف نازک کے بارے میں بھی اسلامی تہذیب کے رویے کی وضاحت کی ہے۔ ان کے خیال میں عورت کا مقام ثریا سے بھی بلند ہے۔ تصویر کائنات اسی کے وجود سے رنگین ہے، زندگی کے سوز دروں کا باعث اسی کا ساز ہے، وہ قوت تخلیق کا مخزن ہے۔ وہ اگر افلاطون نہیں بن سکی تو کیا ہوا، وہ نہ ہوتی تو افلاطون کیونکر وجود پذیر ہو سکتا۔ عورت کا مقام زینت اشتہار اور شمع محفل بننے سے کہیں برتر ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ فاطمۃ الزہراؓ کی طرح، تربیت افراد کے ذریعے، ملت کے مستقبل کو روشن تر بنانے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔

عورت کے مرتبہ و مقام' دائرۂ کار اور مساوات مرد و زن اور تحریک آزادی نسواں کے سلسلے میں اقبال کے افکار ان کی اعتدال پر مبنی روشن فکر کا ثمر ہیں۔ ان کی رائے میں زمانہ ء حال کی تحریک آزادی نسواں کا اصل مقصد عورت کو اس کے حقیقی مرتبہ و مقام سے آشنا کرنا نہیں' بلکہ اس کو بے مقصدیت اور بے معنویت کے عذاب میں مبتلا کرنا ہے۔ آج مغرب میں عورت کا سر پر رومال اوڑھنا تو جرم ہے' لیکن بے پردگی بلکہ برہنگی قابل تحسین ہے۔ نکاح کا ارادہ محل اعتراض ہے' لیکن آزادانہ جنسی ملاپ پسندیدہ ہے۔ مغرب کی اس روش پر کسی نے خوب تبصرہ کیا ہے: Free to bare but not to cver- مغرب میں عورت کو مرد کا رفیق نہیں' فریق بلکہ زیادہ واضح لفظوں میں رقیب بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس طرح ایک نئے معاشرتی فتنے کا دروازہ کھل گیا ہے جس کا نتیجہ معاشرتی انتشار کی صورت میں برآمد ہو رہا ہے۔ علامہ اقبال نے "جاوید نامہ" میں ایک فرنگی دوشیزہ کو تحریک آزادی نسواں کی تبلیغ کرتے ہوئے دکھایا ہے جو عورتوں کو فطری وظائف کی ادائیگی سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور مرد کے ساتھ تعاون و رفاقت کی روش ترک کرنے پر ابھارتی ہے۔ اسی طرح فلک قمر "طاسین مسیح" میں ٹالسٹائی کے خواب میں ایک دوشیزۂ افرنگیں کو استروطی سے نبرد آزما دکھایا ہے۔ اقبال نے فرنگی تہذیب کی نمائندہ افرنگیں کو بے رحمی' بے یقینی اور خطرناک ذہنی رویے کا مظہر بتایا ہے۔ اگرچہ پروفیسر این میری شمل نے اس طرز فکر پر اقبال کو ہدف تنقید بنایا ہے' لیکن سچی بات یہ ہے کہ شمل کی یہ تنقید بے بنیاد' بے دلیل اور محض تعصب پر مبنی ہے۔

اس بحث سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی ثقافت کثیر الجہتی ہونے کے باوجود اندرونی وحدت سے ہمکنار ہے' ایک ایسے نظام زندگی کے زیر اثر تشکیل پاتی ہے جو زندگی کے جملہ گوشوں کی تعمیر و تہذیب کے لیے ہمہ گیر اور موثر اصول فراہم کرتا ہے۔ ان اصولوں میں یہ استعداد موجود ہے کہ ان کی وسعت میں مختلف خطوں اور نسلوں کے لوگ اپنے امکانات ذات کو بروئے کار لا کر پھلیں پھولیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں سال پرانی تہذیبوں کے وارث لوگوں کے لیے اسلامی اصولوں کو اپنانا سہل ہو گیا۔ علاوہ ازیں اسلامی اصولوں پر عمل کرنے سے معاشرہ زمانی اعتبار سے دوام و استقلال سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ اسلامی ثقافت اور جمود متضاد ہیں' جبکہ حرکت و تغیر اسلامی تہذیب کی فطرت میں داخل ہیں۔ وہ زمانے کے ساتھ آگے کی طرف سفر کا میلان رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بہت سی کافرانہ اور مشرک تہذیبوں کے منفی اثرات کا بے جگری سے مقابلہ کیا اور دشمن قوتوں کی یلغار کو ناکام بنایا۔ اس نے ثابت کر دکھایا کہ وہ نہ صرف مکانی بلکہ زمانی اعتبار سے بھی پھیلاؤ کی بے پناہ استعداد رکھتی ہے۔ ایک زمانے میں تاتاریوں نے عالم اسلام کو تاراج کیا' لیکن کچھ عرصے بعد وہی تاتاری حلقہ ء اسلام میں داخل ہو گئے۔ دنیا کی بہت سی تہذیبیں حوادث زمانہ کا شکار ہو گئیں۔ آج تاریخ میں ان کا صرف نام باقی ہے یا دنیا میں ان کے صرف آثار قابل مشاہدہ ہیں۔ لیکن اسلامی ثقافت کو شدید بحرانوں میں بھی اس کی اندرونی قوت نے ہمیشہ قائم و برقرار رکھا۔ اقبال نے رموز بے خودی میں اسلامی ثقافت کی اسی خصوصیت کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

آسماں با ما سر پیکار داشت
در بغل یک فتنہ ء تاتار داشت
بندہا از پاکشود آں فتنہ را
بر سر ما آزمود آں فتنہ را
فتنہ ء پامال راہش محشرے
کشتہ ء تیغ نگاہش محشرے
خفتہ صد آشوب در آغوش او
صبح امروزے نزاید دوش او
سطوت مسلم بخاک و خوں تپید
دید بغداد آنچہ روما ہم ندید
تو مگر از چرخ کج رفتار پرس
زاں نو آئین کہن پندار پرس
آتش تاتاریاں گلزار کیست؟
شعلہ ہائے او گل دستار کیست؟
زانکہ مارا فطرت ابراہیمی است
ہم بہ مولیٰ نسبت ابراہیمی است
از تہ آتش براندازیم گل
نار ہر نمرود را سازیم گل
شعلہ ہائے انقلاب روزگار
چوں بباغ ما رسد گردد بہار
رومیاں را گرم بازاری نماند
آں جہانگیری' جہانداری نماند
شیشہ ء ساسانیاں در خوں نشست
رونق خم خانہ ء یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند
استخوان او تہ اہرام ماند
در جہاں بانگ اذاں بودست و ہست
ملت اسلامیاں بودست و ہست

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں

ادھر ڈوبے ادھر نکلے' ادھر ڈوبے ادھر نکلے!

اس وقت اسلامی ثقافت کو جو خطرات لاحق ہیں' ان میں سب سے بڑا خطرہ مغربی تہذیب کا ہے۔ مغربی تہذیب نے اگرچہ مسلم اثرات کے تحت جنم لیا' لیکن اس کی نشوونما ایک ایسے ماحول میں ہوئی جو اسلام کی روحانی و اخلاقی تعلیمات سے محروم تھا' اس لیے اس پر عموماً" مادہ پرستی غالب رہی ہے۔ مغربی تہذیب کے مادہ پرستانہ رویے نے دنیا کو تباہی و بربادی کے گڑھے کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔ تسخیر کائنات کے جوش میں انسان اپنے آپ کو بھلا بیٹھا ہے۔ وہ احترام آدمیت کے جذبے سے محروم ہو چکا ہے۔ اقبال نے یکم جنوری 1938ء کے ریڈیو پیغام میں اس حقیقت کو واضح کیا۔ خود مغربی اہل فکر بھی اس صورت حال کے نقاد ہیں۔ لیکن اہل مشرق کو ابھی تک اس تہذیب کی خرابی کا مکمل ادراک نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مسلم ممالک کے عوام و خواص مغربی تہذیب سے مرعوب ہوتے جا رہے ہیں۔ کسی زمانے میں مغربی تہذیب کے علمبرداروں نے ہتھیاروں کی جنگ سے مسلمان ممالک پر قبضہ کیا تھا' آج وہ سیاسی چالوں' اقتصادی اور ثقافتی پیش قدمی کے ذریعے غلبہ حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ اقوام متحدہ ان طاقتوں کی لونڈی ہے۔ عالمی بنک اور عالمی مالیاتی فنڈ ان کے آلہ ء کار ہیں۔ امریکہ' برطانیہ اور فرانس وغیرہ اپنے بجٹ کا کثیر حصہ اپنی ثقافت کو برآمد کرنے پر صرف کرتے ہیں۔ اور ہمارے دانشوروں کی کیفیت! بقول ڈاکٹر علی شریعتی:

> "کوئی شک نہیں کہ مغرب کا فکری اور تمدنی سامراج' استعمار کی دوسری تمام شکلوں سے زیادہ خطرناک اور خوفناک ہے' اور نامرئی بھی۔ اس فکری یورش سے متاثر لوگ پہلے بے تعصب بنتے ہیں اور پھر دین و ایمان کے معاملے میں ایک مختلف رجحان اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح وہ مغربیت اور مغربی استعمار کی جملہ ادائیں قبول کرنے لگتے ہیں اور اپنے نظام تمدن سے بے تعلقی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان افرنگ مآبوں کی مدد سے استعماری معیشت اور فوجی مداخلت آسان ہو جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تمدنی سامراج دوسرے سامراجوں کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ تمدنی اور فکری استعمار کارگر نہ ہو تو فوجی اور اقتصادی استعمار کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں۔"

کسی زمانے میں ہمارے نوجوان مغربی جامعات میں درس حاصل کرتے تھے' آج مغربی ممالک ہماری تعلیم کی اپنے مقاصد کے تحت تشکیل اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہمارے نوجوانوں کو دین سے بے بہرہ کرنے اور مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگنے میں مصروف ہیں۔ مغربی تہذیب کے جلو میں فحاشی' عریانی اور بے راہروی کا سیلاب آ رہا ہے۔ ٹیلی ویژن' وی سی آر' ڈش انٹینا اور دوسرے ذرائع ابلاغ اسلامی تہذیب کو شکست دینے میں مصروف ہیں۔ مغربی استعماری اور استکباری نظام کے اس رویے کی بھرپور وضاحت جواد نسفوری نے "شناخت استکبار" میں دلائل و شواہد کی مدد سے بہت بھرپور انداز سے کی ہے۔

اس عالم میں مغربی تہذیب کی یلغار بے پناہ دکھائی دیتی ہے۔ عالم اسلام سیل فرنگ کی زد میں ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی تہذیب اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ لیکن اس صدی میں مسلم مفکرین، خصوصاً اقبال نے جس طرح اسلامی تہذیب کی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے اور مغربی تہذیب کی خامیوں پر نقد و نظر کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب کی ظاہری چکاچوند زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہ سکے گی۔ لیکن اس صورت حال کا مداوا تبھی ہو سکتا ہے کہ جب دانشوران ملت مرعوبیت کا شکار نہ ہوں، مایوسی میں مبتلا نہ ہوں، مثبت اور تعمیری انداز سے مغربی تہذیب کی خوبیوں اور خامیوں کا بہ نگاہ عمیق جائزہ لیں اور قوم کی فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔ اقبال نے اگرچہ تہذیب مغرب کی خامیوں کو بڑی شدت سے ہدف تنقید بنایا، لیکن انہوں نے کہیں بھی اعتدال و توازن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اقبال کا یہی رویہ کم و بیش مشرق کے بارے میں ہے، وہ اس کے نقائص سے بھی آگاہ ہیں اور ان کی اصلاح کے داعی ہیں۔ اقبال کو اگر مغرب کی مادہ پرستی پر اعتراض ہے تو وہ مشرق کی دنیاوی امور سے بے اعتنائی سے بھی نالاں ہیں:

شرق، حق را دید و عالم را ندید
غرب در عالم خزید از حق رمید

اس لیے ان کی تلقین یہ ہے کہ

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

○

اقبال اکادمی پاکستان
لاہور کی خصوصی پیش کش

کلیاتِ اقبال
اُردو

(خاص الخاص ایڈیشن)

- اغلاط سے پاک۔
- مضبوط اور پائیدار جلد مع گولڈن ڈائی خوبصورت حاشیہ۔
- عمدہ اور معیاری کتابت۔
- درآمد شدہ اعلیٰ قسم کا کاغذ۔

قیمت : ۸۰۰ روپے

(ایک نسخے کی خریداری پر بھی ۴۰ فیصد شرح رعایت دی جائے گی)